محمد بلال

حیات امین احسن

(۱۷)

سماجی وسیاسی شعور

امین احسن دینی فہم وفراست کے ساتھ ساتھ بہت گہرا سماجی وسیاسی شعور بھی رکھتے تھے۔ صحافی اور کالم نگار عطاء الرحمٰن نے اس حوالے سے لکھا:

”... انھیں مولانا مودودی کی اس حکمت سے روزِ اول سے اختلاف تھا کہ جماعت کو فوراً انتخابی سیاست میں کود پڑنا چاہیے۔ ان کے نزدیک حقیقی اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے معاشرے کو تیار کرنے میں بڑا وقت اور محنت درکار ہے۔ اس کے بغیر انتخابات کے میدان میں مقابلے کے لیے آ کھڑا ہونا الٹے نتائج کا حامل ہوگا۔ اس کے باوجود انھوں نے نظم جماعت کے تحت ۱۹۵۱ء کے انتخاباتِ پنجاب میں حصہ لیا، لیکن ۱۹۵۷ء میں اپنے ساتھیوں سمیت اسی بنائے اختلاف پر جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ ایک مرتبہ حکمت عملی کے اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ دیکھو عزیز من! اگر یہ معجزہ رونما ہو بھی جاتا ہے کہ جماعت کو عام انتخابات میں بھرپور کامیابی حاصل ہو جائے حالانکہ مجھے اس کے دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آتے تو میں علیٰ وجہ البصیرت تمھیں یہ بتاتا ہوں کہ اسے اقتدار میں آنے سے روکنے کے لیے ایک بہت بڑا اور خونی فوجی انقلاب برپا ہوگا اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ یہ غالباً ۱۹۶۸ء کا ذکر ہے۔ اس وقت تو مجھے مولانا اصلاحی کی بات سمجھ میں نہ آئی لیکن بعد میں جب ۱۹۷۰ء کے انتخابی نتائج سامنے آئے اور آگے چل کر ۱۹۹۲ء میں جو کچھ الجزائر میں ہوا، اس سے میں مرحوم کی بے پناہ سیاسی بصیرت اور دور بینی کا بڑی شدت سے قائل

ہوتا چلا گیا۔ تاہم میں یہاں پر ذاتی معلومات کی بنا پر یہ بات بھی لکھ دینا چاہتا ہوں کہ مولانا مودودی اپنی عظمت و فکر کی بنا پر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد اس نتیجے تک پہنچ گئے تھے کہ ان کی حکمت عملی غیر نتیجہ خیز رہی ہے۔ وہ جماعت کو دوبارہ اپنے اصلی طریق کار پر واپس لانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ۱۹۷۲ء میں مجلس شوریٰ کے اجلاس میں ایک قرار داد بھی منظور کرائی تھی لیکن اس پر عمل نہ ہوا۔ حالانکہ جماعت کی قیادت اگر اس وقت بھی اس راہ پر چل نکلتی تو آج ملک میں ایک بہت بڑی عوامی انقلابی قوت بن چکی ہوتی۔ آج جو اسے بار بار شکستوں کے بعد انتخابات کے بائیکاٹ کی بے معنی پالیسی اختیار کرنا پڑی ہے، اس سے بچی رہتی۔" (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۴۷)

غامدی صاحب، امین احسن کے سیاسی شعور کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ صرف دین ہی کے عالم نہ تھے، دستور و قانون اور سیاستِ دوراں کے مسائل پر بھی ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ ان کے ماہرین ان کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔ ان چیزوں کو دیکھنے کا ان کا اپنا ایک انداز تھا جو اہل زمانہ سے بہت کچھ مختلف تھا۔ بھٹو صاحب کو پھانسی کی سزا ہوئی تو مذہبی حلقوں میں، بالعموم اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ اس سے اگلے روز میں رحمٰن آباد حاضر ہوا تو امین احسن کو افسردہ دیکھا۔ میں نے پوچھا تو کچھ دیر کے لیے خاموش رہے، پھر فرمایا: مجھے بھٹو صاحب سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے، لیکن جن احمقوں نے ایک قومی رہنما کو ختم کر دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے، وہ نہیں جانتے کہ اس طرح انھوں نے اس ملک کی سیاست میں ایک مستقل عناد کی بنیاد رکھ دی ہے۔ افغانستان میں جو کچھ ہوا، اس کے مضمرات انھوں نے جس طرح ابتدا ہی میں سمجھ لیے تھے، اسے آج لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ الجزائر، ترکی اور مصر و شام میں اسلامی تحریکوں کے معاملات کو وہ جس نظر سے دیکھتے تھے، ہمارے مذہبی رہنما شاید اس وقت دیکھیں گے، جب بہت کچھ ڈوب چکا ہو گا۔ جماعتِ اسلامی سے ان کی علیحدگی جس موقف کی بنیاد پر ہوئی، وہ اب اپنی صحت کے لیے کسی بحث و استدلال کا محتاج نہیں رہا۔ اس کی اصابت خود ان لوگوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دی ہے جو اس وقت مولانا مودودی کے مشیروں میں ان کے سب سے بڑے مخالف تھے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سن لیا ہے کہ اپنے امیر سے وہ آج وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو آج سے برسوں پہلے امین احسن نے ان کے "امیر المومنین" سے کہا تھا۔"

(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۲۷-۲۸)

طنز و مزاح

امین احسن کا طنز و مزاح تفکر و تفنن کا حسین امتزاج ہوتا تھا۔ جب ان کی رگِ ظرافت پھڑکتی تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ ایسی مسکراہٹ دیکھ کر انھیں جاننے والے جان لیتے تھے کہ اب قوس قزح کے رنگ بکھرنے لگے ہیں، حتیٰ کہ بیماری میں بھی یہ رنگ پھیکے نہیں پڑتے تھے۔ عبدالرزاق صاحب اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:

''آج مولانا کی طبیعت اتنی اچھی نہ تھی کہ وہ اٹھ بھی سکتے، اس لیے ہم خود ہی ان کے کمرے میں چلے گئے۔ مولانا کمرے میں بیڈ پر آرام فرما رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ گفتگو کی۔ میرے لیے یہ بات بڑی حیرت کی ہے کہ اتنی ضعیفی اور کمزوری کے باوجود مولانا کی حسِ مزاح اور شگفتگی ابھی تک برقرار ہے۔

مولانا کا موقع و محل کے مطابق مزاح بہت ہی اعلیٰ پائے کا ہوتا ہے۔''

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۸)

غامدی صاحب نے اس ضمن میں لکھا:

''ایک صاحب نے، جن سے دین کی خدمت کے معاملے میں وہ ایک زمانے میں اچھی توقعات رکھتے تھے، بڑے اہتمام کے ساتھ کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کیں۔ ان میں وہ تمام مکاتب فکر کے علما کو بلاتے اور ان سے تقریریں کراتے تھے۔ دین کی خدمت کا جو تصور امین احسن رکھتے تھے، اس میں ظاہر ہے کہ اس طرح کی چیزوں کے لیے کوئی گنجایش نہ تھی۔ وہ صاحب انھیں بھی دعوت دینے آئے۔ امین احسن نے پوچھا: ان کانفرنسوں سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ سب نقطہ ہاے نظر کے لوگ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوں۔ انھوں نے جواب دیا تو امین احسن نے بے ساختہ کہا: بھانت بھانت کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی یہ خدمت تو ریلوے پچھلے سو سال سے انجام دے رہی ہے۔ میرا خیال ہے، اس کے لیے آپ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اس معاملے میں بھی وہ صاحبِ طرز تھے۔ ایک بڑے عالم اور مصنف سے ناراض ہوئے تو ان پر پڑھے کم، لکھے زیادہ کا فقرہ چست کیا۔ مستشرقین کے اسلوبِ تحقیق پر تنقید کی تو اس کے لیے مکھی کو گھس گھس کر بھینس بنانے اور ٹڈے کی ٹانگ پر ہاتھی کا خول چڑھانے کے محاورے ایجاد کیے۔ فاطمہ جناح کی حمایت میں متحدہ محاذ بنا تو اسے مینڈکوں کی پنسیری باندھنے سے تعبیر کیا۔ اسی زمانے میں مولانا مودودی کا ایک جملہ

بہت مشہور ہوا کہ ایک طرف ایک مرد ہے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں اور دوسری طرف ایک عورت ہے جس میں عورت ہونے کے سوا کوئی خرابی نہیں۔ امین احسن نے اس پر تبصرہ کیا: تعجب ہے، ان لوگوں میں کوئی ایک مرد بھی ایسا نہیں نکلا جو ایک ایسے مرد کا مقابلہ کر سکے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں ہے۔...

...ان کے ایک پرانے ساتھی نے بتایا کہ ''جماعت'' کی طرف سے انھیں میانوالی بھیجا گیا۔ میں ان کا رفیق سفر تھا۔ ہم بس کے ذریعے سے جا رہے تھے۔ سرگودھا کے اڈے پر بس رکی تو انھوں نے مجھ سے کہا: گھی سمجھ کر تیل کھانے سے بہتر ہے کہ تیل سمجھ کر تیل ہی کھایا جائے۔ جاؤ ایک نان اور کچھ پکوڑے لے آؤ۔...

... طبیعت میں شگفتگی تھی، اپنی بیماری کا ذکر بھی کرتے تو لب و لہجہ ایسا ہوتا کہ چہروں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ مذہبی حماقتوں پر ان کی خاص نظر رہتی تھی، یہ ذکر چھڑ جاتا تو ان کی گل افشانیِ گفتار کا عالم دیکھنے کی چیز ہوتا۔ لفظ لفظ میں تلمیح و تعریض سے وہ مضمون پیدا کرتے کہ سننے والا صاحبِ ذوق ہوتا تو اش اش کر اٹھتا۔ ان کے پرانے دوستوں میں سے ایک مذہبی رہنما سے اسی طرح کی بعض باتیں سرزد ہوئیں تو ان پر تبصرے کے لیے ایسے خوب صورت اسالیب ایجاد کیے کہ خوف فساد خلق نہ ہوتا تو میں سناتا اور لوگ دیکھتے کہ امین احسن کو قدرت نے لفظ و معنی کو رشتہ بپا کرنے کی کیا صلاحیت بخشی تھی اور کس کمال سے نوازا تھا۔''

(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۲۱، ۲۵، ۲۸)

ایک دفعہ ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب نے ان کی بعض منفرد آرا کے بارے میں سوال کیا کہ مولانا، آپ سے پہلے بھی کسی نے یہ بات کہی ہے؟ امین احسن مسکرائے اور کہنے لگے:

''اگر مجھ سے پہلے بھی کسی نے یہ بات کہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ مجھے کیوں پیدا کرتا۔''

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶۸)

عبدالرزاق صاحب نے اپنی ڈائری میں لکھا:

''اس بار بھی مولانا نے بڑی دلچسپ باتیں کیں۔ کہنے لگے کہ میں حیران ہوتا ہوں کہ میں نے اتنی کتابیں لکھ کیسے لیں۔ آج تو ایک صفحہ تک نہیں لکھ سکتا اور حیرت ہوتی ہے کہ میں نے ۹ جلدوں پر مشتمل تدبر قرآن تک لکھ ڈالی۔ مولانا نے مزید کہا کہ وہ آج کل اپنی ہی لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھ رہے ہیں اور بعض اوقات کو انھیں خود اپنی لکھی ہوئی تحریر پر یقین نہیں آتا کہ میں نے کیسے لکھ لی۔

مولانا نے مولانا حمید الدین فراہی کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ وہ بڑے ذہین شخص تھے۔ اگر وہ برطانیہ جیسے ملک میں ہوتے تو زیادہ بہتر کام کر سکتے تھے۔“ (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۸)

جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ لکھتے ہیں:

”ایک مرتبہ کافی عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔ میں نے صحت کا حال دریافت کیا۔ فرمانے لگے: دوران سر کی تکلیف ہے۔ گراں گوشی بھی ہے، کسی کی سنتا نہیں اپنی سنائے جاتا ہوں۔ کراچی گیا تھا۔ وہاں ڈاکٹروں نے جدید آلات سے معائنہ کیا، دوائیں تجویز کیں مگر چنداں افاقہ نہیں ہوا۔“ (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۸۱)

ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہیں:

”مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ایک گھنٹہ گفتگو رہی۔ مجھے جو کچھ بھی پوچھنا ہوتا اسے کاغذ پر لکھ کر انھیں پیش کرتا چونکہ مولانا کی قوت سماعت یکسر دم توڑ چکی تھی، البتہ بولتے بالکل صاف تھے۔ نقاہت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ نماز میں میرے دونوں جانب دو آدمی اس اندیشہ کے تحت ہوتے ہیں کہ کہیں میں زمین بوس نہ ہو جاؤں۔“ (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۴)

ڈاڑھی، پردہ اور فیشن

امین احسن لاہور سے بیگم توصیف محمود صاحبہ کے نام ایک خط میں دین کی جزوی باتوں کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مجھے اس بات سے اطمینان ہوا کہ آپ داڑھی کو دین کا ایک جزو مانتی ہیں۔ اگر مانتی ہیں تو پھر اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پیدا ہوتا کہ یہ چھوٹا جزو ہے یا بڑا جزو۔ اگر چھوٹا جزو ہے جب بھی انسان کی سعادت اسی میں ہے کہ اس کا اہتمام کرے جو باتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو دین کے ساتھ آدمی کے گہرے تعلق کا اظہار انھی کے اہتمام سے ہوتا ہے جو آدمی دین کے فرائض و واجبات سے غفلت کرتا ہے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کا اہتمام کرتا ہے، وہ تو بلاشبہ، حضرت مسیحؑ کے ارشاد کے مطابق، مچھر کو چھانتا اور اونٹ کو نگلتا ہے۔ لیکن جو آدمی فرائض و واجبات کو ادا کرتا ہے اس کے لئے چھوٹی چیزوں سے بے پروائی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر ایک شخص لوگوں کی ہزاروں لاکھوں کی امانتیں ادا کرتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کسی کے چند روپوں کی امانت میں خیانت کر کے خائن اور نادہندہ کہلائے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ دین کی بنیادی باتوں میں سرگرم ہوتے ہیں وہ جزئیات کے اہتمام میں بھی بڑے سرگرم ہوتے ہیں۔ وہ یہ نہیں پسند کرتے کہ وہ خدا اور رسول

سے کسی معمولی بات کے معاملے میں شرمندہ ہوں۔ ایک دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ دین کی کسی بات کو، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اگر لوگ حقیر سمجھنے لگیں اور اس کا اختیار کرنا تہذیب اور فیشن کے خلاف سمجھا جانے لگے تو ہر صاحب ایمان پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اہل زمانہ کے علی الرغم وہ اس چیز کو زندہ اور قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ جو مسلمان دین کی کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لئے یہ غیرت دکھاتا ہے اور مذاقِ زمانہ سے مرعوب ہوئے بغیر اس کا اہتمام کرتا ہے اور اس کی خاطر اندر اور باہر کے لوگوں کے طعن و تشنیع کا ہدف بنتا ہے، دین میں اس شخص کا درجہ مجاہد فی سبیل اللہ کا ہے۔ چنانچہ اس دور میں جو تعلیم یافتہ نوجوان کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول میں بھی داڑھی رکھتے ہیں میں ان کو مجاہد سمجھتا ہوں اور انہی سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ اس زمانے میں وہ اسلام کی کچھ خدمت کر سکیں گے۔ علیٰ ہٰذا القیاس جدید تعلیم پائی ہوئی ان لڑکیوں کے لئے بھی میرے دل میں بڑا احترام ہے جو محض حکمِ شریعت ہونے کی بنا پر پردہ کا اہتمام کرتی ہیں، اس لیے کہ تہذیبِ جدید کے ماحول میں پردہ بھی اسی طرح مذاق بن کے رہ گیا ہے جس طرح داڑھی۔

درحقیت دین کے احکام کی قدر و قیمت کے تعین میں ان حالات کو بڑا دخل ہوتا ہے جن حالات میں وہ کام انجام دیے جاتے ہیں۔ اگر دین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا کام بھی ایسے زمانے میں کیا جائے جس زمانے میں اس کام کا کرنے والا ہر محفل میں نکو بن جاتا ہو تو اس کام کا درجہ بہت اونچا ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں داڑھی صرف ایک نیکی ہی نہیں بلکہ آدمی کی ایمانی غیرت اور اس کے عزم و رسوخ کا سب سے بڑا نشان ہے۔

یہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس مفروضے پر کہا ہے کہ داڑھی ایک چھوٹی چیز ہے۔ لیکن میرے نزدیک داڑھی چھوٹی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک ملی و اسلامی شعار کی ہے۔ یہ ایک مسلمان کے مسلمان ہونے کی ظاہری علامت ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص اس کو مٹاتا ہے تو وہ ایک اسلامی شعار کو مٹاتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شخص اپنے مسلمان ہونے پر احساسِ فخر کی بجائے احساسِ کمتری میں مبتلا ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ جو شخص اپنے دین کے معاملے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو اس سے کس خیر کی امید کی جا سکتی ہے۔

آخر میں یہ بات بھی عرض کروں کہ جو لوگ دین کی معمولی باتوں کی ہمت نہیں رکھتے ان سے دین کے کسی بڑے کام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا ہے کہ جو شخص ایک پیسے میں چور ہے، ایک لاکھ امانت کس طرح ادا کر سکتا ہے۔" (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۲۴-۲۵)

امین احسن کے قریبی رفیق ڈاکٹر شہباز حسین روایت کرتے ہیں کہ مولانا امین احسن نے بتایا کہ ایک دفعہ انھوں نے مولانا فراہی سے ڈاڑھی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ جس طرح دیگ کا ایک چاول پوری

دیگ کی کیفیت کی غمازی کرتا ہے، اسی طرح ڈاڑھی پوری شخصیت کی غمازی کرتی ہے۔ اس کے بعد میں نے مولانا فراہی سے ڈاڑھی کے بارے میں کبھی سوال نہیں کیا۔ ڈاکٹر شہباز حسین کے بقول مولانا اصلاحی کہا کرتے تھے کہ میں ڈاڑھی کے اندر سے نکلنے کا قائل ہوں، یعنی لوگ دل سے اور برضا و رغبت رکھیں۔

غیر شعوری مزاح

امین احسن بڑی تیز حسِ مزاح رکھتے تھے۔ بعض اوقات تو محسوس ہوتا تھا کہ انھوں نے جو جملہ کسا ہے، وہ بہت غور و فکر کے بعد تخلیق کیا ہے، مگر عمر کے آخری حصے میں غیر معمولی نسیان کی وجہ سے بعض اوقات ان سے غیر شعوری طور پر مزاح کا صدور ہو جاتا تھا۔ مثال کے طور پر چند دن پرانی بات کو برسوں پرانی بات کہہ کر بیان کر رہے ہوتے تھے۔ ایک آدمی ان کے ساتھ صبح کسی مسئلے پر بات کر کے گیا تو شام میں اسی آدمی کے ساتھ وہی بات کسی اور آدمی کی بات کہہ کر کر رہے ہوتے تھے۔ رجم کے معاملے میں ان کے موقف سے ہماری مذہبی دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا: اب آپ کی رجم کے بارے میں کیا رائے ہے؟ تو انھوں نے ذہن پر زور ڈالا، پھر بے بسی کے عالم میں اپنے پرانے رفیق اسحاق ناگی صاحب سے پوچھا: کیوں بھئی، رجم کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کہیں میں اس کا منکر تو نہیں ہوں؟ ناگی صاحب اس پر ہنسنے لگے۔ پھر امین احسن بولے: بھئی، جو بھی رائے ہو گی، دلائل کی بنیاد پر ہی قائم کی ہو گی، آج بھی کوئی دلائل کے ساتھ اسے غلط ثابت کر دے تو ڈگیں ڈال دیں گے۔

غیرت حق

امین احسن غیرت حق کو جزو ایمان قرار دیتے تھے۔ وہ ہر معاملے پر بہت غور و فکر کیا کرتے تھے۔ مخالف اور موافق دلائل کا اچھی طرح جائزہ لیا کرتے تھے۔ جب حق اچھی طرح واضح ہو جاتا تو پھر مخالفین کو کوئی رعایت دینے کے قائل نہ تھے۔ رجم کی سزا کے اطلاق کے بارے میں انھوں نے مسئلے کو صحیح معنوں میں قرآن کی روشنی میں دیکھا اور پھر ہر خوف سے بے نیاز ہو کر اپنا موقف کھل کر بیان کیا۔ دوسرے اہل علم اس مسئلے میں روایات کی روشنی میں قرآن کی شرح کرتے تھے، مگر امین احسن قرآن کی روشنی میں روایات کی وضاحت کرتے تھے۔ اس سے ان کی فطری طور پر رائج موقف سے مختلف رائے قائم ہوئی۔ ملک اور بیرون ملک میں تقلید و جمود کے رسیا لوگوں نے ان کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا۔ آداب علم سے بے بہرہ ایک گروہ کی جانب سے

انھیں یہ بھی کہا گیا کہ اپنی راے واپس لیں، ورنہ نقصان اٹھانا پڑے گا، مگر امین احسن اس دھمکی کو بالکل خاطر میں نہ لائے۔ پھر انھیں کہا گیا کہ ہم آپ کو عدالتوں میں گھسیٹیں گے۔ امین احسن کا جواب تھا: ضرور ایسا کیجیے تاکہ مجھے اور باتیں کہنے کا موقع ملے، جو میں ابھی تک زبان پر نہیں لایا۔ ایک عزیز دوست نے ان کے اپنی راے پر اصرار کو خلاف مصلحت قرار دیا تو امین احسن کا جواب تھا:

''میرے اور آپ کے درمیان ایک اصولی اختلاف ایسا ہے کہ میں آپ کو اپنی رائے کا قائل نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہ میں کوئی رائے اختیار کرنے میں اصل اہمیت دلیل کو دیتا ہوں، اشخاص کو اہمیت میرے نزدیک ثانوی ہے۔ اس کے برعکس میں آپ کو اصل اعتماد اشخاص پر ہوتا ہے، دلیل کو آپ دوسرے درجے میں رکھتے ہیں۔ میں اس معاملے میں آپ کو ملامت نہیں کرتا۔ اول تو اس میں مزاج کو دخل ہے۔ ثانیاً میری ذمہ داریاں آپ کی ذمہ داریوں سے مختلف ہیں۔ مجھ پر تحقیق سے اگر کوئی حق واضح ہو جائے تو واجب ہے کہ اس کو عندالضرورت برملا کہوں، اگرچہ میرا سر قلم کر دیا جائے۔ لیکن آپ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے۔''(۲۷)

احساس ذمہ داری

امین احسن پر ذمہ داری چاہے مالی نوعیت کی ہو یا علمی نوعیت کی، وہ دونوں پہلوؤں سے بہت حساس تھے۔ ۲۲/ مارچ ۱۹۷۳ء کو رحمان آباد سے سردار محمد اجمل لغاری کو خط میں لکھتے ہیں:

''امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ میں آپ کی حسن وتدبیر وتدبر کا نہایت ممنوں ہوں کہ میں عزت و آبرو کے ساتھ رقبہ پر آ گیا ہوں۔ الحمد للہ اب میں کسی کا قرض دار نہیں ہوں۔ سب قرضے آپ کی تدبیر سے اللہ تعالیٰ نے ادا کر دیے ہیں۔ میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ میں جب تک لوگوں کا پائی پائی ادا نہ کر لوں گا اس وقت تک لاہور سے نہ نکلوں گا۔ قرضوں کے بار کا احساس یوں تو مجھے ہمیشہ رہا لیکن بیماری کے بعد تو اس احساس نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ اس سے میری کمر ٹوٹی جا رہی تھی۔ الحمد للہ اب میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ اور اس کے لیے تہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ صورت حال اتنی سنجیدہ ہو گئی تھی کہ آپ کے سوا کوئی دوسرا اس کو حل نہیں کر سکتا تھا۔

یہاں میرے آشیانے پر اگرچہ دن میں چڑیوں، مکھیوں، بھڑوں کی یورش رہتی ہے اور شب میں چمگادڑوں کی، لیکن الحمد للہ میں لکھنے کا کام پورا کر لیتا ہوں۔ البتہ شب میں لکھنے کا کام نہیں کر سکتا، اس لیے کہ لالٹین کی روشنی میں نگاہ پر زور پڑتا ہے۔ اگر حالات مساعد رہے تو تین ماہ میں چوتھی جلد تیار کر دوں گا جو سورۂ نور پر تمام ہو گی۔ آدھے سے زیادہ کام اس کا ہو چکا ہے۔''(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۳)

جنگجو طبیعت

۲۱/ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں محمود احمد لودھی کے نام ایک خط میں امین احسن نے اپنی جنگجو طبیعت کے بارے میں لکھا:

''یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ کا مطالعہ قرآن جاری ہے۔ میں نے بھی کسی نہ کسی شکل میں کچھ نہ کچھ کام جاری رکھ چھوڑا ہے۔ یہ کام اس دور کے لوگوں کے لیے ایک بے مزہ اور غیر مفید کام ہے۔ اس وجہ سے نہ میں پہلے پر امید تھا نہ اب ہوں۔ لیکن اداے فرض کے طور پر کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتا ہوں۔ کسی کو اس سے نفع پہنچے یا نہ پہنچے، خود میرے لیے یہ نافع ہے۔

افسوس ہے کہ ادھر تحریر کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ کچھ تو بار بار مکان کی تبدیلی کے سبب سے ایک الجھن سی رہی۔ پھر جنگ نے ساری توجہ اپنی طرف جذب کر لی۔ میں آدمی تو قرطاس و قلم کا ہوں لیکن طبیعت جنگجو پائی ہے۔ اس وجہ سے اس چیز سے بڑی دلچسپی ہے۔ ریڈیو اور اخبارات سے اس دوران میں طبیعت کا یہ شوق پورا کرتا رہا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ ڈھاکے کی آب و ہوا آپ کو راس آئی ہو گی اور آپ وہاں زندگی کے نئے تجربات سے آشنا ہوں گے۔ اس دوران میں اپنے مشرقی بھائیوں سے متعلق میرے علم میں بھی بعض نئے اضافے ہوئے ہیں۔ اب تک انگریزوں کے پروپیگنڈے کے زیر اثر ہمارا ذہن یہ بنا ہوا تھا کہ بنگال کے لوگ جنگ کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ لیکن اس جنگ میں یہاں جو مشاہدے ہوئے ہیں ان سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ انگریزوں کی شرارت تھی کہ انھوں نے بنگال کے لوگوں کو فوج سے الگ رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی ہو گی کہ سید احمد شہید ؒ کی دعوت جہاد کو سب سے زیادہ آدمی اسی علاقے سے ملے تھے۔ بہرحال اس جنگ کے فوائد میں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ بنگال کے متعلق یہ دیرینہ غلط فہمی رفع ہو گئی اور دنیا پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اللہ کے فضل سے ہمارے دونوں بازو شمشیر زن ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۹۱)

عالمانہ شان، اندھی تقلید اور ذوق تحقیق

سینئر صحافی مجیب الرحمٰن شامی نے امین احسن کی عالمانہ شان، اندھی تقلید سے بے زاری اور ذوق تحقیق کے بارے میں لکھا:

''مولانا اصلاحی نے بڑی سرگرم زندگی گزاری۔ وہ قلم کے بھی دھنی تھے اور زبان کے بھی۔ اردو توان کی

مادری زبان تھی، ہی عربی کے رموز واسرار پر بھی وہ ایسی عالمانہ نظر رکھتے تھے کہ ان کا شاید ہی کوئی ہم سر موجود ہو۔ قرآن کی زبان اور زمانۂ جاہلیت کے عربی ادب پر ان کو بے مثال عبور تھا۔ ان کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کو تفسیری ذخیرے میں انتہائی اہم مقام حاصل ہے۔...

مولانا اصلاحی آنکھ بند کر کے کسی کے پیچھے چلنے والے نہیں تھے۔ وہ کھلی آنکھ سے مسائل کا جائزہ لیتے اور پھر اپنی رائے کا بلا جھجک اور بے دھڑک اظہار کر دیتے۔ وہ اپنے شاگردوں اور نیاز مندوں سے اندھی تقلید کا مطالبہ نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کے ذوقِ تحقیق اور تجسس کو ابھارتے اور ان سے آزادانہ رائے قائم کرنے کی توقع رکھتے۔ تقلید کا بند دروازہ کھولنے پر انھوں نے بڑا زور دیا، اس پر بڑی طاقت صرف کی۔''

(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ۲۹)

علم اور عمل

لاہور سے ۶/ جون ۱۹۶۶ء کو محمود احمد لودھی صاحب کو خط میں امین احسن بے عمل، علم کے بارے میں متنبہ کرتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں ہے کہ بعض اوقات زیادہ تفصیلات معلوم کرنے کا شوق آدمی کے لئے فتنہ بن جاتا ہے۔ اگرچہ علم میں قناعت پسندی کے بجائے حرص کا رویہ صحیح ہے لیکن یہ اسی حالت میں جب اس حرصِ علم کے ساتھ اس کے برابر عمل کا جذبہ بھی ہو۔ یہ نہ ہو تو یہ علم وبال بن کے رہتا ہے۔''

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۲۰)

اعتراف حق

کسی بھی محقق کو اپنی راے بڑی عزیز ہوتی ہے۔ وہ اس میں نشان زد کی جانے والی کسی غلطی کا جلد اعتراف نہیں کر پاتا، مگر امین احسن اس معاملے میں بھی ایک استثنا تھے۔ اس ضمن میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''فراہی سے انھوں نے قرآن پڑھا، اس کی زبان کا وہ ذوق پایا جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ نظمِ قرآن فراہی کی دریافت ہے، لیکن امین احسن نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اسے وہاں پہنچا دیا ہے کہ اس کے منکر بھی اب انکار کے لیے کوئی راہ نہیں پاتے۔ امین احسن کا پایۂ علم وہی تھا جو اس امت میں مختلف علوم وفنون کے ائمۂ مجتہدین کا رہا ہے۔ زبان، ادب، فلسفہ و حکمت اور قرآن کے معارف، ان سب میں وہ جس مقام پر فائز تھے، اس سے آگے کوئی مقام آسانی سے تصور میں نہیں آتا۔ ان علوم میں لاریب، وہ اپنے وقت کے امام تھے۔

ان کی بعض نئی تحقیقات سے متعلق جب کوئی شخص ان سے متقدمین کے کسی حوالے کا تقاضا کرتا تو وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کہتے: مطمئن رہیے، کچھ عرصے کے بعد ہم بھی متقدمین ہی ہو جائیں گے۔ میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ میں نے ان کی مجلس میں صدیوں کے عقدے لمحوں میں کھلتے دیکھے اور بارہا اعتراف کیا ہے کہ:

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدنِ برقے
ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم[12]

ان کا مقام یہی تھا، لیکن اس کے باوجود اپنی کسی عزیز سے عزیز رائے اور تحقیق کے خلاف بھی کوئی حق اگر سامنے آگیا ہے تو ان کے دل و دماغ کو میں نے اس طرح اس کے سامنے جھکتے دیکھا ہے کہ حیرت ہو جاتی تھی۔ ان کے مدرسۂ علمی کا میں پچھلی صفوں میں بیٹھنے والا ایک طالب علم ہوں۔ سورۂ توبہ میں 'اشہر حرم' کا مفہوم انھوں نے جس طرح متعین کیا ہے، اس پر مجھے اطمینان نہیں ہو سکا۔ میرا خیال تھا کہ بات بہت سادہ ہے، لیکن انھوں نے اسے جس طرح دیکھا ہے، اس کے نتیجے میں یہ بہت کچھ الجھ گئی ہے۔ انھی کے فیض تربیت سے جو کچھ پایا ہے، اس کی روشنی میں ایک مرتبہ بہت ڈرتے ڈرتے میں نے اپنا نقطۂ نظر ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ میری بات سنتے رہے، سوالات بھی کیے، اس کے بعد چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے، پھر فرمایا: میں نے اس آیت پر برسوں غور کیا اور اس کے بعد ایک رائے قائم کی تھی، لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر بڑے تاثر کے عالم میں یہ شعر پڑھا:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است''[13]

(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص۱۷-۱۸)

جزع فزع سے گریز

دکھ درد ہر شخص کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں، مگر عام طور پر لوگ ہمت ہار جاتے ہیں اور جزع فزع کرنے

۱۲۔ ''وہ یہ راہ بجلی کے چمکنے پہ طے کر لیتا ہے، مگر ہم نادان چراغ و شمع کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی روشنی کرے تو چلیں۔''

۱۳۔ ''یہ خیال نہ کرو کہ پیر مغاں کا کام انتہا تک پہنچ گیا ہے، رگ تاک میں ایسے ہزاروں جام پڑے ہیں جن کو ابھی کسی نے نہیں چھوا۔''

لگتے ہیں، مگر امین احسن اس معاملے میں بہت مضبوط اعصاب رکھتے تھے اور کوئی کم زور بات زبان پر نہ آنے دیتے تھے۔ صحافی اور کالم نگار جناب ارشاد احمد حقانی لکھتے ہیں:

”... جماعت اسلامی حلقۂ لاہور کے ایک اجتماع کے موقع پر بھی اس گاڑی کو سڑک پر حادثہ پیش آگیا تھا جس میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ مجھے اس تقریب کا ”ناظم اجتماع“ مقرر کیا گیا تھا۔ اس حادثے کے بعد جس میں دونوں بزرگوں کو چوٹیں آئی تھیں ان کی نگہداشت اور ابتدائی طبی امداد کی فراہمی بھی میرے فرائض میں شامل تھی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ مولانا اصلاحی نے انتہائی ضبطِ نفس کا مظاہرہ کیا اور تکلیف کے اس وقت میں بھی ان کی زبان اور اد و وظائف سے تر تھی اور وہ مسلسل اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔“ (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۴۷)

اشخاص اور دلیل

امین احسن کی دنیا میں بڑی بڑی شخصیات کی کوئی حیثیت نہ تھی، وہ دلیل کی بنیاد پر بات مانتے تھے اور دلیل کی ہی بنیاد پر دوسروں کو قائل کرتے تھے۔ لاہور سے ۵ر نومبر ۱۹۸۴ء کو امین احسن نے سردار محمد اجمل خان لغاری کے نام خط میں اسی پہلو سے لکھا:

”عنایت نامہ موصول ہوا۔ ایک مدتِ دراز کے بعد اچانک عطوفت نامہ کا نزول طویل حبس کے بعد ابرِ رحمت کے برسنے سے زیادہ خوش آئندہ تھا۔ اس توجہ فرمائی کا دلی شکریہ۔ میں نے اس کی رسید بھجوادی تھی اور خط رکھ لیا تھا کہ بعض ضروری کاموں سے فرصت پانے کے بعد مفصل جواب لکھوں گا۔ لیکن آج جواب لکھنا چاہا تو دو صفحے لکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ اس طول کلام سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میرے اور آپ کے درمیان ایک اصولی اختلاف ایسا ہے کہ میں آپ کو اپنی کسی رائے کا قائل نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہ میں کوئی رائے اختیار کرنے میں اصل اہمیت دلیل کو دیتا ہوں۔ اشخاص کی اہمیت میرے نزدیک ثانوی ہے۔ اس کے برعکس آپ کا اصل اعتماد اشخاص پر ہوتا ہے، دلیل کو آپ دوسرے درجہ میں رکھتے ہیں۔

میں اس معاملہ میں آپ کو ملامت نہیں کرتا۔ اول تو اس میں مزاج کو دخل ہے۔ ثانیاً میری ذمہ داریاں آپ کی ذمہ داریوں سے مختلف ہیں۔ مجھ پر تحقیق سے اگر کوئی حق واضح ہو جائے تو واجب ہے کہ اس کو عندالضرورت برملا کہوں اگرچہ میرا سر قلم کر دیا جائے۔ لیکن آپ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے۔

رجم کے معاملہ میں آپ کو میری رائے سمجھ میں نہیں آئی، لیکن جو رائے آپ اختیار کیے ہوئے ہیں کیا

آپ اس کو سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں بلکہ محض تقلید کی بناء پر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ آپ تقلید کے ساتھ کسی مسلک کو اختیار کر کے عند اللہ بری ہو سکتے ہیں لیکن میں نہیں بری ہو سکتا۔“

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۲۹)

[باقی]

انسانی جان کی حرمت

”... مذہب و اخلاق کی رو سے انسانی جان کو... حرمت ہمیشہ سے حاصل رہی ہے...۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اِس کے بارے میں یہی تاکید اِس سے پہلے بنی اسرائیل کو کی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ بات اُن پر لکھ دی تھی کہ ایک انسان کا قتل درحقیقت پوری انسانیت کا قتل ہے۔... سورۂ مائدہ میں قرآن نے اِسی کا حوالہ دیا ہے:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا. (۵:۳۲)

”(انسان کی) یہی (سرکشی) ہے جس کی وجہ سے ہم نے (موسیٰ کو شریعت دی تو اُس میں) بنی اسرائیل پر بھی اپنا یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی ایک انسان کو قتل کیا، اِس کے بغیر کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک انسان کو زندگی بخشی، اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔““

(جاوید احمد غامدی، میزان ۲۳۲)